محمد خالد اختر کے ناولوں میں طنزنگاری

ڈاکٹر محمد رحمان

Dr. Muhammad Rehman

Assistant Professor, Department of Urdu,
Hazara University, Mansehra.

عطیہ جدون

Atiya Jadoon

Ph.D Scholar, Department of Urdu,
Hazara University, Mansehra.

Abstract:

Muhammad Khalid Akhtar enjoys high prestige in Urdu litrature,and when it comes to humorous and satirical writing,Muhammad Khalid Akhtar can be ranked among the finest of all times. His unique writing style made his work more intresting and entertaining, earning him an ever-lasting position in urdu literature. His writings are capable of pulling some strings in the minds of those who can dig for deeper meaning. His writings are both relatable and enjoyable, and always leave the reader with some food for thought. In the following paper,the significance of satire in Mohammad Khalid Akhtar's writing is haghlighted.

محمد خالد اختر کے ناول اردو ادب میں اچھوتے موضوعات کی بنا پر سب سے الگ اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ محمد خالد اختر کی پہچان صرف ناول نگاری ہی نہیں رہی بلکہ وہ ادب کی دنیا میں Jack of all Trades تھے۔ شاید ہی کوئی صنف ایسی ہو جس میں وہ اپنے دل کی بات نہ کہہ سکے ہوں۔ محمد خالد اختر کے ناولوں میں تمام تر فنی وفکری لوازمات کے ساتھ ساتھ جو بات غور وفکر کی طرف مائل کرتی ہے وہ ان کا طنز ہے۔ طنز درحقیقت انسان کے دل کی آواز ہے۔ ایک ادیب بُنیادی طور پر حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ جب بھی معاشرے میں کوئی ناانصافی، بے اعتدالی یا پھر کوئی ناپسندیدہ عمل

دیکھتا ہے تو اپنے قلم کے زور پر آواز بلند کرتا ہے یا پھر یہ کہنا بھی بجا ہوگا جب یہ حساس دل اور بیدار دماغ دنیا کے حالات اور انسانی معاشرے کی برائیوں اور بدحالیوں پر کُڑھتا ہے تو انسانی سماج کی اصلاح و فلاح کے لیے اِظہار کا راستہ تلاش کرتا ہے۔ یہاں ادیب کے لیے اظہار کا مؤثر راستہ طنز و تشنیع ہے۔

طنز کا سادہ ترین مفہوم تو یہی ہے کہ یہ انسان کے اندر کا سچ ہے اور یہ سچ تلخی اور کڑواہٹ کے زہر بجھے نشتر کی مانند ہوتا ہے۔ یہ زہرناکی ظرافت کی شیرینی سے کم کی جاتی ہے۔ اگر صدائے حق بلند کرنے والا پُرسوز ہوگا تو بات بھی پُراثر ہوگی اور ''ظرافت'' طنز نگار کو خوش گلو بناتی ہے۔ جہاں طنز نگاری کی حدیں ظرافت و مزاح سے جدا ہوتی ہیں وہاں صرف اندازِ بیاں اور مقصد کی دیواریں کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر مصنف حقیقت پسند نہ ہو سچ جھوٹ میں تمیز نہ کرسکتا ہو تو طنز پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ طنز نگار کی سوچ اور فکر میں ''حقیقت'' بنیادی اساس ہے۔ طنز بامقصد و پُرتاثیر بنانے کے لیے مزاح مضبوط سہارا بن کر ساتھ چلتا ہے۔ محمد خالد اختر اس حقیقت سے مکمل طور پر آشنا تھے۔ ان کی تحریروں میں طنز مزاح کے زیرِ اثر ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پڑھنے والے کو اکثر خالد اختر کی شخصیت میں اردو ادب کے مایہ ناز مزاح نگاروں کی جھلک بھی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی ان کا انداز سب سے جدا اور نرالا ہے۔

خالد اختر کی تحریروں میں ایک ایسے نبض شناس ادیب سے ملاقات ہوتی ہے جو اپنے لب و لہجے سے تلخ جام کا مے نوش لگتا ہے اور پھر اسی لب و لہجے کے ساتھ اکثر مقامات پر جامۂ تبسّم میں ملبوس بھی نظر آتا ہے۔ عام طور پر خالد اختر کی تحریر میں براہِ راست طنز سے گریز ہے لیکن کہیں کہیں کچھ مقام ایسے ہیں کہ آخر کار ان کا دل بھی درد سے بھر آتا ہے۔ طنز نگار کے لیے لازم ہے کہ اس کا ماحول اور معاشرے سے گہرا تعلق ہو۔ وہ حالات حاضرہ سے باخبر بھی رہے۔ خالد اختر میں یہ شعور موجود تھا۔ وہ حالاتِ حاضرہ کی شدھ بدھ بھی رکھتے تھے اور ماحول اور معاشرے سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ ان کا ناول ''بیس سو گیارہ'' تو کامل طنز کی مثال ہے۔ اور اس ناول میں اگر مزاحیہ صورتِ واقعہ جیسی خصوصیت شامل نہ ہوتی تو یہ ناول سراسر طنزیہ ناول ہی کہلاتا۔ ''بیس سو گیارہ'' کا پہلا باب جو مصنّف کے قلم سے بطور پیش لفظ تحریر کیا گیا ہے، محض تعارف یا تمہید کی حد تک نہیں رہا بلکہ سراپا طنز بن کر پڑھنے والوں کے ذہن پر مستقبل کی تباہ کاریوں کا خوف ثبت کر گیا ہے۔ ایٹمی جنگ کے بعد کے حالات بین الاقوامی سطح پر دنیا کے ہر ملک کے لیے ہی خطرے کی گھنٹی بجاتے ہیں۔ خالد اختر دیکھ رہے تھے کہ دنیا جنگوں کی آماجگاہ بن چکی ہے۔ طاقت ور ممالک نے دنیا کا امن و سکون برباد کرنے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ ان ممالک نے ''امن بذریعہ جنگ'' کی پُرتشدد اور دوغلی حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے۔ بظاہر حقوق انسانی اور امن و سلامتی کی بات کی جاتی ہے لیکن در پردہ تباہی و بربادی کا کھیل جاری و ساری ہے۔ خالد اختر نے اس فریب سے بھی پردہ اُٹھا ڈالا۔ یہاں اُن کے الفاظ اور جملوں میں زہرناکی کی حد تک تیز دھار کاٹ

ہے:

’’آدمی نے اپنے خالق کو بتا دیا تھا کہ گو وہ (آدمی) تخلیق نہیں کر سکتا، مگر وہ تباہ کر سکتا ہے، اور تباہ بھی اپنے خالق سے زیادہ بہتر اور مکمل طریقے سے۔‘‘(۱)

اس ناول میں خالد اختر کا اشارہ پس منظر میں ایٹم بم کی تباہ کاریوں کو مدِنظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ امریکہ، فرانس، رُوس اور ہندوستان کا ذکر بھی کیا گیا۔ اور وقتاً فوقتاً جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثرہ ہر پہلو کا ذکر کیا۔ پس پردہ ایٹم بم کا موجد انتہائی سفاک اور ظالم انسان ہے۔ خالد اختر کا پیغام بھی امن وسلامتی تھا اور یہی ان کی خواہش بھی تھی۔ شاید اس لیے انہوں نے اپنے تینوں ناولوں میں حکمرانوں، سیاست دانوں اور ظلم و بربریت جیسی سوچ رکھنے والے انسانوں پر طنز کیا ہے۔ ایٹمی جنگ کی تباہ کاری پر طنز کا اظہار کچھ اس طرح دُکھ بھرے انداز میں کرتے ہیں:

’’طوفانِ نوح کے بعد یہ دوسری عالم گیر تباہی تھی، مگر اس سے کہیں زیادہ اپنے اندر کینہ پرور اثرات لیے۔ طوفانِ نوح کے وقت دنیا مقابلتاً بچہ تھی۔۔۔۔۔۔ اس لیے طوفانِ نوح نے اس کرّے پر برّ ِاعظموں کے برِّ اعظموں پر فاتح چیختے ہوئے پانیوں کو دوڑا کر سوائے حیوانی اور انسانی زندگی کے کچھ زیادہ تباہ نہیں کیا کیوں کہ تباہ کرنے کے لیے کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس کے برعکس ۱۹۹۲ء کے اس طوفان نے جو آدمی کی خود اپنی جدّت اور قوّت کا پیدا شدہ تھا قرنوں کی قیمتی روایات، ہزاروں سال کے حاصل کیے ہوئے علوم کی میراث کو زائل کر دیا اور بچی ہوئی دنیا کو حقیقتاً صدیوں پیچھے بربریت کی طرف پھینک دیا۔‘‘(۲)

خالد اختر کے قلم کی کاٹ بہت گہری اور تلخ ہے۔ وہ انسانی رویوں اور معاشرتی کمزوریوں پر گرفت تو کرتے ہیں لیکن شاید انہیں مصلح یا مبلّغ بننے کا شوق نہیں۔ کیوں کہ وہ تو مصلحین اور مبلغین کو بھی طنز کا نشانہ بنانے سے باز نہیں آتے۔ خاص طور پر ناول ’’بیس سو گیارہ‘‘ میں ماضین ریاست کے حوالے سے انہوں نے معاشرت، مذہب، ادب، تعلیم اور وزارت پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ ملکی حالات پر طنز اور تنقید کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ ان خیالات کا اگر بین السطور مطالعہ کیا جائے تو ان الفاظ میں وطنِ عزیز کے لیے درد ہے، دُکھ اور افسوس ہے۔ انہوں نے دُکھ بھرے انداز میں پاکستان کے لیے اِسلامستان کا لفظ استعمال کیا۔

خالد اختر کی تحریروں میں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کا طنز مفرد صورت میں یا الگ اکائی

کے طور پر نہیں آیا۔ ان کی نثر میں طنزیہ جملے پڑھنے میں نہیں آتے بلکہ طنز، کرداروں، واقعات اور اقتباسات میں ایک تبصرے، کیفیت یا صورتحال کے طور پر نمایاں ہوا ہے۔ یہ تحریر کے پس منظر یا سیاق وسباق سے بے بنیاد نہیں۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ اگر چہ ان کے طنز میں تلخی ہے لیکن یہ تلخی مزا کرا کرا نہیں کرتی بلکہ بین السطور کی ظرافت ان کی زہرناکی کو مٹھاس میں تبدیل کر دیتی ہے۔ شوکت سبزواری نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''طنز میں تلخی اور شدت ہے اس لیے ادب میں اس کے لیے خاص اسالیب و بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ طنز کی کڑوی کسیلی گولیاں ان اسالیب کے لطف و چاشنی کی مدد سے حلق سے اتاری جاتی ہیں۔ مزاح ان میں سب سے اچھا اور پر لطف پیرایہ بیان ہے جو طنز کی روح کے لیے مناسب ہے اور اس کے مزاج کے لیے سازگار بھی ہے انشاء پردازوں نے طنز کے نشتروں کو ان کی ظاہری تیزی اور زہرناکی کا اثر ہلکا کرنے کے لیے ہی مزاح کے رنگ میں پیش کیا۔ مزاح طنز کے عمل جراحی کے لیے غش آور دوا کی حیثیت رکھتا ہے۔'' (۳)

خالد اختر کا طنز اس اصول پر پورا اُترتا ہے۔ ان کے ہاں طنز اور مزاح پہلو بہ پہلو چلتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ مزاح کی ڈگر پر چلتے چلتے طنز راستے سے بھٹک جائے۔ ان کا نشانہ درست اور تیر زہر آلود ہیں لیکن وہ محض تیر انداز ہی نہیں بلکہ ان کے طنز میں جو بات اہم اور نمایاں ہے وہ مقصد سے ان کا سنجیدہ لگاؤ ہے۔ ان کا طنز صرف طنز نہیں اور مزاح صرف مزاح نہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں جو موضوع بھی لیا اس کے ہر پہلو کو زیر بحث رکھا۔ گویا ہر زاویے سے انصاف کیا۔ خالد اختر کا طنز مقصدیت سے عاری نہیں بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ یہ معاشرتی تضادات، سماجی ناانصافیوں اور غیر انسانی رویوں کے خلاف ایک باشعور ادیب کا احتجاج ہے۔ ان کا طنز ان کے ضمیر کی ایسی آواز ہے جو ظریفانہ انداز کی حامل بھی ہے۔ ''چاکیواڑہ میں وصال'' اور ''مسکراتا ہوا بدھ'' اگر چہ مزاحیہ کہانی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انہوں نے ظرافت کا انداز بھی اپنایا ہے اور اپنے منفرد انداز کی روش بھی برقرار رکھی ہے۔ پس پردہ ہر اہم موڑ پر طنز کی کاٹ موجود ہے۔ معاشی و معاشرتی لحاظ سے بہت اہم نکات طنز کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے تینوں ناولوں میں مجموعی طور پر تعلیمی و ادبی رویّے اور صداقت پسندی جیسے موضوعات طنز کا ہدف رہے۔

کسی بھی ملک وقوم کی ترقی اور ترویج میں تعلیمی مقاصد، فکر اور سوچ نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ خالد اختر نے جہاں ملکی، حکومتی، مذہبی اور ادبی رویوں پر نکتہ چینی کی وہاں تعلیم جو کہ بنیادی اہمیت کی حامل ہے، ان کا قلم وہاں بھی نہ رُکا۔ ''بیس سو گیارہ'' میں تو انہوں نے صحیح معنوں میں ایک ایسی قوم کا

نقشہ کھینچ ڈالا جسے اپنی عوام کی تعلیم و تربیت اور ملکی ترقی سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ یہاں کے وزیرِ تعلیم کو علامتی انداز میں نام بھی وزیرِ جہالت دیا۔ عام طور پر ہمارے آس پاس محکمہ تعلیم سے منسلک اہم عہدوں پر تعینات افسران ایسی ہی سوچ اور فکر لیے ہوتے ہیں۔ خالد اختر نے جن باتوں اور مسائل کو باریک بینی سے ۱۹۵۰ء میں دیکھا، سمجھا اور پھر لکھا وہ تمام باریکیاں آج نئی صدی میں بدرجہ اتم موجود ہیں اور ہر سُو حکومتی وزراء میں نظر آ رہی ہیں۔ ''بیس سو گیارہ'' میں تو بہت گہرائی سے ان حقائق کو پیرایۂ طنز میں بیان کیا گیا ہے:

> ''وزیرِ جہالت: وزیرِ جہالت کا چہرہ لکڑی سے تراشا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی لکڑی جو کھردری اور گھٹیا قسم کی ہو۔ اس کا چہرہ کسی قسم کی ذہانت اور سمجھ سے عاری ہے............ وہ ایک تعلیم یافتہ جاہل ہے۔ تعلیم نے اس کو کوئی غلط خیال نہیں دیئے اور اسے قطعاً نہیں بگاڑا، جس طرح یہ دوسرے ہزاروں نوجوانوں کو بگاڑ دیتی ہے۔''(۴)

اسی طرح تعلیمی نصاب پر بھی ان کا طنز بہت گہرا اور واضح ہے:

> ''میں یہاں میں تبدیلی کی ایک مثال دوں گا۔ مثلاً پہلے درسی کتابوں میں عموماً بڑے بڑے آدمیوں کی زندگیاں طلباء کے سامنے پیش کی جاتی تھیں، تاکہ وہ ان کی تقلید کر سکیں یا ان کے کردار کا مطالعہ کر سکیں۔ ان بڑے بڑے آدمیوں میں مشہور جرنیل، مشہور مصنف، شاعر اور مشہور مخیر وغیرہ ہوتے تھے اور کسی خاص ملک کی قید نہ تھی........... اب ماضنین کے نئے میں اُن بڑے بڑے آدمیوں کی ایک فہرست بنا دی گئی ہے جو باقاعدہ حکومت سے منظور شدہ ہیں اور اس فہرست سے باہر کوئی آدمی بڑا نہیں مانا جا سکتا۔''(۵)

اس ناول میں وزیرِ تعلیم اور تعلیمی نصاب دو حساس ترین شعبے زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ ۱۹۵۰ء میں بیٹھ کر ایک ادیب نے ۲۰۱۱ء کی پیشن گوئی کر ڈالی۔ نصف صدی پہلے نصف صدی بعد کی جھلک دیکھ لی اور ایسا نقشہ کھینچا جو ہوبہو موجودہ دور کی تصویر ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے اہم اداروں کے وزرائ، ہمارا گرتا ہوا تعلیمی معیار اور ہمارے ہر صوبے ہر علاقے کا اپنا اپنا ترتیب دیا گیا نصاب محمد خالد اختر کی بیان کردہ حقیقت سے کس قدر قریب ترین ہے۔ خالد اختر بذاتِ خود کھلے ذہن اور کشادہ سوچ کے مالک تھے اس لیے مذہب، سیاست، تعلیم ہر معاملے میں ان کی سوچ دین و دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی تھی۔ خالد اختر زندگی کے کسی بھی معاملے

میں نمود و نمائش کے قائل نہ تھے۔ یہاں تک کہ علم و فضل کی نمائش کے بھی ہرگز قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا یہ مقصد نہیں تھا چنانچہ سماجی سطح پر تعلیم کو نمود و نمائش بنانے والے بھی خالد اختر کی نشتر زنی سے نہ بچ سکے۔ مزاح میں لپٹا، سمٹا ان کا یہ طنز غور طلب ہے:

> ’’چنگیزی یار! وہ تمہارے پاس ایک سیاہ گاؤن اور وہ پھندنے والی چوکور سی ٹوپی ہے نا! جو تم نے بی اے کی ڈگری لیتے وقت بنوائی تھی۔۔۔۔ وہ علمیت اور فضیلت کی اجارہ داری کے امتیازی نشانات!‘‘ ....’’سیاہ گاؤن اور چوکور ٹوپی جو رسمِ اسناد کے موقعے پر تم نے اچھے سمجھ دار سنجیدہ آدمیوں کو (جو عام حالات میں کبھی ایسی حرکت کے مرتکب نہیں ہو سکتے) پہنے ہوئے دیکھا ہوگا، اور جن میں وہ کچھ کچھ پرندے سے لگتے ہیں، پہاڑی کووں سے مشابہ۔‘‘(۶)

خالد اختر کے طنز کی کاٹ سماجی نکتہ نظر سے ہر مقام اور ہر جگہ نظر آتی ہے۔ انہیں جہاں کہیں غیر متوازن احساس ملا وہ اُس پر نکتہ چینی کرنے سے خود کو روک نہ سکے۔

خالد اختر کا طنز کسی خاص پہلو یا نکتے تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے تمام تر معاشرتی رویے اپنے طنز کا ہدف بنائے۔ جہاں کہیں بے اعتدالی تھی وہاں وہاں خالد اختر کے دلی جذبات نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ انہوں نے حقائق کے بیان میں پوری ایمان داری سے کام لیا۔ اُن کا اپنا تعلق ادب کی دنیا سے تھا اور انہوں نے اس حوالے سے بھی ادباء اور ادب کی بھرپور نقاب کشائی کی، ورنہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ خود لکھنے لکھانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو سماج کے اس حصّے کو نہ چھیڑیں گے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا اور یہاں بھی پورا انصاف کرتے ہوئے دل کی بات کھلے لفظوں بیان کی۔ ادبی دنیا کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس دنیا کا کوئی منظر ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ اہلِ ادب کے رویوں اور طور طریقوں سے اچھی طرح آشنا تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اہلِ ادب شہرت سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ شعر و ادب کی دنیا میں بھی غلط لوگ موجود ہیں۔ جعلی ادیبوں اور ’’اصلی‘‘ متشاعروں کی ایک فوج ظفر موج ہے۔ جو ادبی منظر نامے پر چھائی ہوئی ہے۔ خالد اختر نے ایک محرم راز کی حیثیت سے ادیبوں اور ان کے ادبی رویے بے نقاب کیے۔ وہ یہ کام براہِ راست کم انجام دیتے ہیں۔ عام طور پر کسی کردار کی صورت میں اس فرض سے عہدہ برا ہوتے ہیں۔ اور یہ کردار بظاہر مضحکہ خیز نظر آتا ہے لیکن اپنے باطن میں ایک تیز اور تلخ طنز لیے ہوتا ہے۔ مثلاً چاکیواڑہ کا قربان علی کٹار خوابوں کی دنیا کا باسی خود فریبی کے گہرے مرض میں مبتلا ہے جب کہ رزم حنائی غیر معروف ادیب ہے۔ جو محض توجہ حاصل کرنے کے لیے ترقی پسند بن جاتا ہے۔ ترقی پسند اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور وہ جلد ہی ’’عظیم ترین طنز نگار‘‘

بن جاتا ہے۔ یہ کردار ترقی پسند تحریک پر ایک مؤثر طنز ہے۔ شداد ہشمی انقلابی شاعر ہے۔ انگریزوں کے رخصت ہوتے ہی اس کی مقبولیت بھی رخصت ہو جاتی ہے۔

''چاکی واڑہ میں وصال'' کا آغاز ہی کچھ ادبی لب و لہجے سے ہوا۔ محمد خالد اختر نے بظاہر مصنف کی زبان سے اور حقیقتاً مجموعی طور پر موجودہ ادبی رجحان کی عکاسی کی ہے:

> ''میرے اپنے ہیرو۔۔۔۔۔۔۔۔میرے حقیقی ہیرو۔۔۔۔۔وہ لوگ ہیں جو کتابیں لکھتے ہیں؛ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کیسی کتابیں لکھتے ہیں (کیوں کہ میں ان کی کتابوں کو کبھی نہیں پڑھوں گا)۔ میں مصنّفوں میں ان کو ترجیح دیتا ہوں جو ادیبِ شہیر یا مصوّرِ جذبات بن چکے ہیں اور اس لیے ہیرو ورشپ کے لیے موزوں ترین تسلیم کیے جا چکے ہیں۔۔۔۔۔۔میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر اپنے اور ملک کے لیے زیادہ مفید ہوتے اگر وہ اپنے یہ شاہکار نہ لکھتے۔ بولٹن مارکیٹ کے ٹرام سٹیشن پر بیٹھے ہوئے بُوٹ پالش کرنے والے میرے ہیروؤں سے بہتر اور سوسائٹی کے لیے زیادہ سودمند کام کر رہے ہیں۔ کیوں کہ لوگوں کے میلے بدنما بوٹوں کو پالش سے چمکا کر آئینہ بنانا' ان کے دماغوں میں بدمذاقی کُوٹ کر بھرنے سے کہیں شریف تر پیشہ ہے۔''(۷)

''بیس سو گیارہ'' میں صحافت کے حوالے سے بھی ادبی رجحان واضح ہے۔ ''شترابا ٹائمز'' ریاست ماضنین کا ایک اخبار جس میں صحافت کے کچھ خفیہ دریچے وا کیے گئے۔ جس طرح سے دنیا کی کئی حکومتیں ذرائع ابلاغ کا سہارا لے کر اپنی حکمرانی کے سیاہ سفید چھپاتی ہیں یا سنوارتی ہیں۔ اسی طرح اس اخبار میں یہی لائحہ عمل اختیار کیا گیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو موجودہ قومی صحافت ان دریچوں میں اپنی جھلک ضرور دکھاتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ماضنین میں وزیرِ جھوٹ اور پٹا خامل کر جھوٹ کی نوعیت اور قدو قامت کو بہترین طور پر عوام کو پیش کرنے کے کام میں اپنی زندگیاں وقف کیے ہوئے ہیں، اور پر خلوص طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ پریس اور محکمۂ دروغ بیانی سے عوام کو بوکھلا کر اور جاہل بنا کر ماضنین کی بہت بڑی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔''(۸)

''چاکیواڑہ میں وصال'' میں مصنف نے جاسوسی ناول نویسوں کی سوچ اور پسند ناپسند کا ذکر نہایت کھلے دل سے کیا ہے۔ محض ناموری اور پیسے کی خاطر یہ ناول نگار کس طرح انسانی ذہنوں سے کھیل

رہے ہیں۔ان ادباء کی سوچ اور ذہنیت خالد اختر نے بہت واضح انداز میں بیان کی۔اس قدر کُھلم کُھلا طنزیہ وار شاید ہی پڑھنے والے اور سمجھنے والے کے لیے کچھ مخفی رہا ہو:

> ''مجھے ان میں کٹار کا ایک ۱۹۴۱ء کا چھپا ہوا ناول ''بے مثال چمگادڑ'' مل گیا............ ٹائٹل مجلد باتصویر تھا اور کٹار کے سب ناولوں کے ٹائٹلوں کی طرح بے حد بدمزاقانہ اور بھونڈا۔ میں اس کو فحش کے لفظ سے بیان کر سکتا ہوں، اگرچہ یہ اس لفظ کے عام معنی کے لحاظ میں فحش نہ تھا۔نہیں نہیں، ٹائٹل پر حسینہ کی تصویر برہنہ نہ تھی؛تم اس کے سینے کے کوہستان اور اس کے لہنگے کو ران کے اوپر سے پھٹا ہوا دیکھ سکتے تھے،مگر وہ حسینہ برہنہ نہ تھی۔وہ ایک کافی فربہ اور موٹے نقوش کی حسینہ تھی اور وہ ایک بڑے بھونڈے رنگین مصنوعی باغ میں ایک فوارے کی منڈیر پر بیٹھی، اوپر ایک بہت بڑی چمگادڑ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے تک رہی تھی، جو ہوا میں سیدھی معلق تھی۔یہی وہ بے مثال چمگادڑ تھی............کٹار کے سب ناولوں کے ٹائٹل ایسے ہی عامیانہ، بھونڈے اور فحش ہوتے تھے اور گو، اندر کا مواد ایسے ٹائٹل کا ہی حقدار ہوتا تھا۔''(۹)

کسی بھی ملک کی ترقی اور کامیابی میں ''ادب'' بنیادی اور اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ خالد اختر نے اس اہم پہلو کو بھی تشنہ ہرگز نہ رہنے دیا۔ جہاں انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری پر چوٹ کی وہاں انہوں نے رزم حنائی کی صورت میں ایک ترقی پسند ادیب کا بھی نقشہ کھینچا۔ترقی پسند ادیب اور ادب دونوں پر ان کا تبصرہ نہایت معنی خیز ہے۔ اسی طرح انہوں نے ناشروں کے استحصالی رویوں پر بھی طنز کے نشتر چلائے ہیں۔

خالد اختر کے ہاں صداقت پسندی کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔یعنی حقائق و واقعات کا ایسا نقشہ کھینچنا جو نہ صرف حالات و واقعات کی من وعن تصویر ہو بلکہ ان کا تعلق ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ بھی ہو۔کسی واقعے کو پیش کرنے کی کوشش میں مصنف کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ صرف مستقبل کا کھوج لگانے سے انکار کرے۔اس لیے کہ ماضی اور مستقبل آنکھوں سے اوجھل ہونے کے باوجود اسی طرح حقیقی ہیں جس طرح حال۔روزمرہ کے عام واقعات وحالات کا عمیق مطالعہ اور ان کا برمحل اظہار حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کہلاتا ہے۔ یہ آفاقی نظریہ معاشی برابری اور سماجی بیداری کا علم بردار ہے۔ داستانوی طرز اور رومانوی میلانات کا ردِّعمل ہے۔جس نے ناول نگاری کو خیال وخواب کی کھوکھلی اور مصنوعی زندگی سے نکال کر کائنات کے سنگلاخ حقائق سے منسلک کیا۔ مافوق الفطرت عناصر سے

اجتناب کر کے عصری تقاضوں کے مسائل سے ہمکنار کیا۔ وقت کی نبض کو ٹٹولا، ۔سماجی شعور کو بیدار کیا۔ مظلوم و بے بس عوام کو جگایا۔ پگڈنڈیوں پر رینگتی اور سسکتی زندگی کو محصور کیا۔ باہمی نفرت میں بننے والی اذیتوں اور ذہنی ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے تصادم سے جو قدریں جنم لیتی ہیں، ان کو ہموار کیا اور ہمیشہ زندہ اور تابندہ رہنے والی قدروں کو اجاگر کیا۔ صداقت پسندی کا مقصد معاشرتی برائیوں کو اس طرح نمایاں کرنا ہے کہ پڑھنے والے کے لیے اصلاحی پہلو موجود ہو۔ معاشرتی مسائل قلم کی گرفت میں لانا، مسخ شدہ تصویر کے کونے پیش کر کے سنوارنا اور نکھارنے کا جتن کرنا، ہر طبقے کے مسائل منظر عام پر لانا یہ تمام عناصر قاری کے لیے صداقت کے در وا کرتے ہیں۔ محمد خالد اختر اسی سچائی و صداقت کے علم دار بن کر نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی اور انسان کی حقیقت ہو بہو بیان کر دینا صداقت پسندی کا اصل مفہوم ہے۔ خالد اختر کا مشاہدہ بہت گہرا تھا چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو اس طرح ہماری نظروں کے سامنے لاتے ہیں کہ آنکھیں چونک جاتی ہیں۔ ان واقعات اور حقائق میں سماج پر ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے۔ خالد اختر نے حقائق کے بیان میں تمام تر سچائی کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں زندگی کی بے پناہ وسعتیں نمودار ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کی تحریروں میں درد و کرب اور تلخی بے پناہ ہے۔ لیکن سچائی کا عنصر ہر بات پر چھایا ہوا ہے۔ یہی یہ سچائی قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے اور یہ سوچ منفی نہیں مثبت ہے۔ ان کے ناولوں کے کردار جو حقیقت کو عملی زندگی میں پیش کرتے ہیں اسی دنیا کے کردار ہیں۔ جس جس طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اسی طبقے کی رُوح ان میں بسی ہوئی ہے۔ خالد اختر ذاتی سطح پر صاف گو اور سچائی کے قائل تھے۔ اس لیے ان کی تحریروں میں سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر کھلا اور واضح طنز موجود ہے۔ وہ ان حقائق کو پیش کرنے میں کہیں جذباتی، کہیں رومانی، کہیں انقلابی، کہیں مبلّغ اور کہیں مصلح و ناصح نظر آتے ہیں۔

''بیس سو گیارہ'' جہاں سراپا طنز ہے وہاں بہت بڑی سچائی بھی ہے۔ انہوں نے معاشرتی اور سیاسی تناظر میں دنیا کے بیشتر ممالک کا احوال بیان کر دیا۔ اس ناول میں خالد اختر نے حکومت اور سیاست سے لے کر ایک عام آدمی کی زندگی تک کے عجیب و غریب تضاد اور منافقانہ رویے بیان کیے۔ مثلاً اس ناول میں حکومتوں کے پروٹوکول میں جو تکلّفات، نمائش اور رکھ رکھاؤ جو عرصۂ دراز سے چلے آ رہے ہیں، انہیں نہایت تفصیل اور تمام تر حقائق کے ساتھ بیان کیا۔ نئی جمہوری حکومتوں میں وزراء کی سوچ، کام کرنے کا انداز، وہ تمام رنگ ڈھنگ جو آج ہر جگہ نظر آتے ہیں، وہ سب ''بیس سو گیارہ'' کا موضوع ہیں۔ اس ناول میں لوگوں کی ذہنی سطح کا بہت سچائی سے نقشہ کھینچا گیا ہے۔ عوام کی مذہبی ذہنیت، تعلیمی رویّے، عورت کے بارے میں ان کی سوچ، ادیبوں کی گروہ بندیاں، آپس کے تنازعات غرض زندگی کے تمام پہلو طنز و مزاح کے پیرائے میں مکمل سچائی کے ساتھ موجود ہیں۔ مختلف مقامات پر عوام کا بے لچک رویہ، سیاسی پارٹیوں اور کمیونسٹوں کے کام کرنے کا انداز، ادباء کی گروہ بندیاں اور اُن

کے تنازعات یہ وہ تمام حالات ہیں جن سے نا صرف ہمارا اپنا ملک گزر رہا ہے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک انہی حالات کا شکار ہیں۔ اقتدار میں بیٹھے ہوئے جمہوریت کے دعوے دار اور اپنی غریب عوام کے نام نہاد غم گسار حقیقت میں کچھ اور ہیں۔ اسی ناول میں ایک مضبوط علامت ''کھلی ہوا کے عاشق'' ریاست ماضنین کی حکومت کے لیے رکاوٹ ہیں۔ کیونکہ غریب ہیں اور روٹی، کپڑا، مکان جیسی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔ اس لیے حکومتی کارندوں کے لیے بھی ناکارہ ہیں۔ ماضنین کا ترتیب دیا گیا دستور کچھ اسی طرح کا ہے جس طرح ہمارے آئین یا لاگو کیے گئے دستور ہیں۔ یعنی جن باتوں پر حلف اُٹھائے جاتے ہیں جن کو لازم مانا جاتا ہے، وہ صرف عوام اور عام سطح کے لوگوں کو سمجھانے کے لیے ہیں سرکار کی بڑی مچھلیاں ان قوانین سے آزاد ہیں۔ وہ ان قوانین اور قاعدوں سے مستثنیٰ ہیں۔ مذکورہ ناول میں خالد اختر کا لہجہ سچ بیان کرتے ہوئے اکثر مقامات پر قدرے سخت اور تلخ ہی رہا۔ طنز کی تلخی اور صداقت پر مبنی یہ جملے بھی غور طلب ہیں:

> ''انسانوں کی زندگیاں کتنی چھوٹی، بے وقعت اور حقیر ہوتی ہیں۔ وہ رواج اور رسم کی بیڑیاں جو وہ خود اپنے ہاتھوں پہن لیتے ہیں وہ کبھی نہیں اترتیں۔ وہ چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہوں کی طرح جیتے اور مرتے ہیں۔۔۔۔ یہ انسانوں کے ساتھ ہمیشہ، ہر ایک بڑے شہر میں ہوتا ہے، مگر شتر ابا میں انسانوں کی لاحاصلی کا احساس زیادہ قوی ہوتا ہے۔ مجھے شک ہے کہ اس شہر میں ماضنین کے باشندوں کا دل اصلی انسانی ہمدری کے دودھ سے خالی ہے؛ کہ وہ صبح سے شام تک تمباکو اور چائے کی مدد سے اپنے ضمیر کو گھوٹتے رہتے ہیں کہ ان کے ضمیر اتنے ہی پتھریلے اور سنگلاخ ہیں جتنے وہ مکان، جن میں وہ رہتے ہیں۔''(۱۰)

اسی طرح مصنف نے حکومتی وزراء کے جو نقشے کھینچے ہیں وہ تقریباً ہر ملک کی ریاست میں براجمان نظر آتے ہیں۔ وزیر جہالت، وزیر جھوٹ، وزیر خوراک اور وزیرِ مالیات ان تمام وزراء کی کردار نگاری اور ان کے مکالمات، ان کی سوچ کا انداز غرض ان کو حوالہ بنا کر خالد اختر نے بہت اندر کی باتیں بیان کیں۔ ان کی صداقت پسندی اور اس سے بڑھ کر کیا ہو گی کہ الفاظ کے چناؤ میں انہوں نے کہیں محتاط رویہ اختیار نہ کیا بلکہ ''جو ہے جیسا ہے'' کو اپنی جگہ اسی طرح قائم رکھتے ہوئے مبالغہ آرائی سے بھی کام نہ لیا۔ طنز کیا تو کھل کر تمام داستان بیان کر دی۔ اس لیے یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ خالد اختر کے قلم میں ایک حقیقت نگار کی سی تلخی اور بیباکی ہے۔ انہوں نے کہیں بھی علامت اور استعارے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایک ذہین تخلیق کار کی طرح قاری کو تمام تر حقائق سے آگاہ کیا اور واقعی ان کے

ناول کے ہر ایک جملے کا بین السطور مطالعہ کیا جائے تو بہت سے حقائق منظر عام پر آتے ہیں۔ بنیادی طور پر ناول ''بیس سو گیارہ'' ایک حساس دل و دماغ رکھنے والے تخلیق کار کی کاوش ہے۔ اس ناول میں بیان کردہ حالات و گفتگو اِک ایسا خواب ہے جو دوسرے بہت سے لوگ دیکھتے ہیں۔ لیکن بولنے کی جسارت نہیں کر پاتے۔ محمد خالد اختر نے علی الاعلان ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔

خالد اختر کے باقی دو ناول ''چاکیواڑہ میں وصال'' اور ''مسکراتا ہوا بدھ'' ان کی طنز و ظرافت کی زندہ و پائندہ مثالیں ہیں۔ یہاں مقام ضرور ایک ہے اور کہانی بھی ہلکی پھلکی سی ہے لیکن انداز وہی بین السطور میں بات کرنے کا انداز گہرا اور فکر انگیز ہے۔ ان ناولوں میں مصنف نے پسماندہ غریب اور اکثر و بیشتر زندگی کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگوں کی داستان بیان کی ہے۔ صحیح معنوں میں سماجی عکاسی جو حرف بہ حرف حق و صداقت پر مبنی ہے ان ناولوں کا حصہ ہے۔ چاکیواڑہ میں کوئی خیالی یا مثالی دنیا نہیں بلکہ حقیقی دنیا ہے۔ یہ حقیقی دنیا ہمارے آس پاس ہر جگہ موجود ہے۔ اس ناول میں بھی خالد اختر کا قلم حقائق کے بیان میں سچ کا داعی بن کر آشکارا ہوا ہے۔ انسانی احساسات اور جذبات کی بہترین ترجمانی اس ناول کا حصہ ہے۔ ''چاکیواڑہ میں وصال'' اہم اور روشن حوالہ طنز و ظرافت ہے۔ اس ناول میں ناول نگاروں کی تخلیقات، ان کی سوچ اور تخیّل کا نہایت خوبصورت بیان موجود ہے۔ مصلحین اور مبلغین جب اُن کے طنز کا نشانہ بنتے ہیں تو وہ کوئی رو رعایت نہیں برتتے اور دلی کیفیت کا اظہار برملا کر ڈالتے ہیں مثلاً:

> ''ذاتی طور سے میں اس لڑکی کو جو کٹار کی شائق ہے، اس لڑکی پر کہیں ترجیح دوں گا جو صرف راشد الخیری اور ڈاکٹر نذیر احمد کو پڑھتی رہی ہے۔ موخر الذکر لڑکی میرے نزدیک بے حد قابل رحم ہے اور اس سے بڑی بدقسمت اور کون سی لڑکی ہو سکتی ہے جس کی زندگی اور خیالات کی تشکیل ان دو قابلِ تعظیم مگر نا قابلِ برداشت بوروں نے کی ہو۔'' (۱۱)

ہمارے معاشرے کا ایک اور بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کی آزادی پر کبھی خوش نہیں ہوئے۔ جو غیر ملکیوں سے ہمیں لے پالک بچے کی طرح مل گیا اس پر ہمیشہ شاداں و رمسرور رہے۔ اس کی مثالیں خالد اختر کے ان دونوں ناولوں میں ملتی ہیں۔ قربان علی کٹار کے روپ میں ایک سست اور کاہل انسان کا بیان ہے۔ اگرچہ اُس کے پاس قلم کی طاقت تھی لیکن وہ غیرت مندی اور خودداری سے بالکل عاری تھا۔ اُسے اپنا پیٹ بھرنے اور سر چھپانے اور تن ڈھانپنے کے لیے اپنے روزگار کی ہرگز پرواہ نہ تھی۔ کیوں کہ اُس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت اُس کے دوست اقبال چنگیزی کی خدا ترسی اور ہمدردی کی وجہ سے پوری ہو رہی تھی۔ ہمارے معاشرے میں انسانوں کا یہی طبقہ اس قدر ڈھٹائی سے اپنی مجبوریاں اور

غربت کا استعمال کرتے ہیں کہ جھوٹ بولنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ''چا کیواڑہ میں وصال'' اور ''مسکراتا ہوا بدھ'' دونوں میں ''کٹار'' کا کردار اسی طرح کا ہے اور مصنف نے اس کردار کے ساتھ بھرپور انصاف اس طرح کیا کہ اس طرح کے کردار کی صحیح معنوں میں نقاب کشائی کر ڈالی۔ ایسی فطری کردار ہمیں اپنے آس پاس نظر آتے ہیں۔ اسی طرح تعلیم و ادب پر ملکی حالات کے تناظر میں ان کی صداقت پسندی طنزیہ انداز کے ساتھ بہت گہری فکر لیے سامنے آئی۔ مثلاً:

> ''چنانچہ اس نے سوچا کہ وہ ناول نویسی کا پیشہ ور اُستاد بن جائے گا، یا شوقین لوگوں کے لیے معاوضے پر ناول لکھ دیا کرے گا۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ انگلستان اور امریکہ میں ناول نویسی کے کورس دیے جاتے ہیں اور کئی مقبول ناولسٹ اب معاوضے پر نئے امیدواروں کو ناول نویسی کے داؤ سکھانے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ ۔۔۔ اس سے شیخ قربان علی کٹار نے یہ اخذ کیا کہ سکھانے کا پیشہ قابلِ تضحیک نہیں۔ اس کی یہ سادہ لوحی تھی کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ ملک انگلستان نہیں ہے اور یہاں لکھنے والے کی حالت ناقابلِ رشک ہے۔ یہاں کوئی شخص ناول نویسی نہیں سیکھنا چاہتا، کیونکہ فاقہ کشی کے اور بھی زیادہ سہل اور دلچسپ طریقے ہیں۔'' (۱۲)

اسی طرح قربان علی کٹار کا ایک پروفیسر کا روپ دھارنا۔ مصنف نے اس مقام پر بھی معاشی سطح پر لوگوں کی سوچ نہایت سچائی سے بیان کر دی کہ ہمارے معاشرے میں معلّمی کا پیشہ اپنے اصل کے ساتھ اکثر و بیشتر تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اساتذہ کو وہ درجہ حاصل نہیں جو کتابوں میں تحریر ہے یا مغربی معاشرے میں نظر آتا ہے۔ یہاں مصنف نے سیاہ گاؤن اور تکونی ٹوپی بطور علامت استعمال کر کے قربان علی کی سوچ اور باقی انسانوں کی سوچ بیان کی ہے، کیوں کہ چا کیواڑہ بھی کوئی خیالی یا مثالی دنیا نہیں بلکہ یہ بھی حقیقی دنیا کا بھرپور عکس ہے۔ یہ عکس ایک حقیقت نگار کے قلم سے کاغذ کے کینوس پر نمودار ہوا ہے۔ ان الفاظ میں جو سچائی کی کڑواہٹ ہونی چاہیے تھی وہ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ کہ ان کی حقیقت نگاری میں تلخی یا افسردگی کا شائبہ تک نہیں بلکہ زندہ دلی اور شگفتگی کا احساس ہمہ وقت قاری کے ساتھ رہتا ہے کیوں کہ یہ ایک مزاح نگار کی حقیقت نگاری ہے۔ اسی طرح سے جہاں خالد اختر نے ضعیف الاعتقاد لوگوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا وہاں بھی انہوں نے کوئی لگی لپٹی نہ رکھی اور کھل کر معاشرے کے جس جس طبقے کو بیان کر سکتے تھے، کیا۔ مثلاً وہ مقام جہاں انہوں نے پروفیسر شاہسوار کو بھیس بدل کر طلسمی انگوٹھیاں فروخت کرتے بیان کیا اُس مقام پر جب مجمع تائب ہو گیا کہ وہ پروفیسر سچ اور حقیقت پر مبنی گفتگو کر رہا ہے۔ یعنی جو کرامات وہ بیان کر رہا ہے وہ درست ہیں۔ اس

جگہ پر جب مجمع کے لوگ انگوٹھی لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو ان کے تاثرات کو نہایت خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہنایا:

> ''مجمعے میں کھڑے ہوئے ایک فوجی نے پہل کی۔ اس نے ایک روپے میں سلیمانی انگوٹھی خریدی اور چار آنے میں سلیمانی تیل کی چھوٹی شیشی جو نگینے کو چمکانے کے لیے ضروری تھی۔ نیلی یونیفارم میں ایک نیوی والے نے بری فوج کو نیچا دکھانے کے لیے دو انگوٹھیاں خریدیں۔ (بری اور بحری فوج میں ایک قسم کی صحت مندانہ رقابت ہے اور وہ ایک دوسرے کو کسی بات میں بڑھنے نہیں دیتے۔) نیوی والے کے چہرے پر فاتحانہ نظر تھی جیسے اس نے بحری فوج کی لاج رکھ لی ہو۔''(۱۳)

اسی طرح ''مسکراتا ہوا بدھ'' میں طنز کی لے ذرا مدھم ہے لیکن کہیں کہیں ایک دو بار ایسے اونچی ہوئی کہ اپنا تاثر چھوڑ گئی۔ طنز کا مقصد چشم کشائی ہے اور خالد اختر اپنے مقصد میں ناکام نہیں ہوئے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کے دلدادہ لوگوں کی بے حسی اور بے غیرتی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ محفل رقص کے بیان میں محمد تنویر کا کردار مثال بنا کر سماج کی یہ حقیقت بھی واضح کر دی۔ ''ایس ایم چکوڑی (ایکس کامیڈین)'' کا کردار ہمارے معاشرے میں پلنے والا وہ ناسور ہے جس کی غرض پسندی، ہوس اور لالچ کی کبھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ کردار صرف اپنے ذاتی مفاد پر نظر رکھتا ہے اور دولت کی حرص اور لالچ اسے اس حد تک اندھا کر دیتی ہے کہ وہ ایک انسان کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ پہلے خوشامد، محبت اور دکھاوے کے خلوص سے لوگوں کے دل جیتتا ہے اور پھر وہ کرتا ہے جس کا تصور بھی ایک انسان کے لیے دل دہلا دینے والا ہوتا ہے۔ جب چکوڑی کے گگلو والے روپ پر کٹار، اسپ اور چنگیزی میں بحث ہو رہی تھی اور کٹار اپنے نئے جاسوسی ناول کے غریب ہیرو ''کریم'' کو گگلو کے روپ میں دکھانا چاہتا تھا۔ اسپ اور چنگیزی اس پیشے کے حق میں نہ تھے اس جگہ کٹار کی زبان سے ادا ہونے والے مکالمے ہمارے معاشرے کی ایک حقیقی جھلک دکھاتے ہیں:

> ''لیکن ہیرو کا گگلو ہونا؟'' اسپ نے کہا۔ ''کٹار صاحب! بات نہیں بنے گی۔ پڑھنے والے اسے قبول نہیں کریں گے۔'' گگلو ہونے میں کیا برائی ہے؟ کٹار تیکھا ہو گیا۔ ایڈووکیٹ یا سرکاری افسر یا ٹھیکیدار یا وزیر ہونے میں کوئی برائی نہیں ہے تو گگلو ہونا کون سا برا کام ہے؟ مقصد تو سب کا دنیاوی کامیابی حاصل کرنا اور روپیہ پیدا کرنا ہے۔ میں نے کریم کو ظالم سماج سے انتقام لیتا دکھایا ہے۔

ظالم سماج بھی ایسے ہی لوگوں کے لیے ظالم ہے، کٹار جیسے لوگوں
کے لیے، جن کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔‘‘(۱۴)

جب تک ایک طنز نگار کے پاس حقیقت کا منطقی اور مادی تصور واضح نہیں ہوگا۔ اس وقت تک طنزیہ کوششیں مضحکہ خیز اور بے معنی ہی رہیں گی۔ طنز میں معنویت اور مقصدیت پیدا کرنے کے لیے صداقت وحقیقت بنیادی اساس ہے۔ اگر اس نکتہ نظر کے مطابق محمد خالد اختر کے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو یقینا انھوں نے اردو ادب کو طنز و مزاح کے حوالے سے گراں قدر سرمایہ عطا کیا ہے۔ اُن کے طنز میں ایسی ہی تلخی ہے جو کسی صاف گو انسان کی بات میں ہوتی ہے۔ وقتی طور پر بری بھی لگے لیکن اپنا اثر ہمیشہ کے لیے سچائی کے ساتھ ہی چھوڑتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ، کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ئ ص: ۲۱۰

۲۔ ایضاً ص: ۲۰۹

۳۔ شوکت سبزواری، اردو شاعری میں طنز، مشمولہ: طنز و مزاح، (تاریخ تنقید، انتخاب)، مرتبہ: ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز۔ ۱۹۸۵ئ ص: ۱۰۷

۴۔ محمد خالد اختر، کتاب مذکور، ص: ۲۴۵۔۲۴۴

۵۔ ایضاً ص: ۲۴۵

۶۔ محمد خالد اختر، چاکیواڑہ میں وصال، کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۱ئ ص: ۲۹

۷۔ ایضاً ص: ۶

۸۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ، ص: ۲۴۲

۹۔ محمد خالد اختر، چاکیواڑہ میں وصال، ص: ۱۳۳

۱۰۔ محمد خالد اختر، بیس سو گیارہ، ص: ۲۳۷۔۲۳۶

۱۱۔ محمد خالد اختر، چاکیواڑہ میں وصال، ص: ۱۳۴

۱۲۔ ایضاً ص: ۳۹

۱۳۔ ایضاً ص: ۷۷۔۷۶

☆......☆......☆